عمران ازفر
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبا
ایف۔ایٹ۔فور۔اسلام آباد

میرا جی، تخلیقی متن اور معنی کے امکانات

(میرا جی)

Ambiguity in meera jee's poetry is infect creative Ambiguity and when we explore meera jee's poem's, we come across more than one meaning and aesthetic sensibility. Two poem's "Tan asaani" and "Sarsarahat" are focused in critical analysis. Author adopted the methodology of close reading in analysis but he supported his point of view with the approach of famous Urdu critics.

میرا جی اردو نظم کی روایت میں نئے پن کا حقیقی آغاز ہیں۔موضوع، ہیت اور برتاؤ کے اعتبار سے میرا جی نے اردو نظم کو ایک نئے جہان سے متعارف کرایا۔ میرا جی کی نظم اپنے کل میں کلاسیکی نظم کا موضوعی اور ہیتی ردِعمل ہے۔ ایک بھر پور اور با اثر ردِعمل،جس نے ٹھہرے پانی میں خوب ہلچل پیدا کی۔یہ نظم اپنے اسلوب، تشبیہات، علامات،ذائقے اور ان سب کے باہمی ادغام و ملاپ سے تشکیل پانے والے تمثالی نظام کی بدولت منفرد بھی ہے اور گہری بھی۔یہ نظم زندگی اور اس سے جڑے حقائق کی پیش کار بھی ہے اور فرد کے داخل اور خارج کے مابین آویزش، توڑ پھوڑ، پیدائش اور فنا کے مسلسل عمل کی نمائندہ بھی۔میرا جی نے اُردو نظم کے موجود نظامِ علامات کو نا صرف رد کیا بلکہ ایک نیا اور مضبوط علامتی نظام قائم کیا جو آج بھی میرا جی سے مختص ہے۔اقبال نئے نظامِ علامات کی تشکیل کے لیے تاریخ کے تصور پر مبنی علمی نظام اور مذہبی پسِ منظر کو استعمال کرتا ہے۔اگر قاری کے ذہن کو ہندوستانی تاریخ، مسلمان افواج کی ہندوستان پر چڑھائی اور اسلامی پسِ منظر سے نابلد کر دیا جائے تو اقبال کا تفہیمی نظام کمزور ہوسکتا ہے۔راشد ہند، ایرانی اثرات کے باوجود اپنا ربط ہندوستانی ماحول سے قائم رکھتا ہے۔جس کے باعث راشد کی شاعری گہری بھی ہے اور بامعنی بھی۔میرا جی کا نظامِ علامات ہندی تہذیب اور عالمی ادبی نظام سے ماخوذ ہے۔میرا جی کی علامتیں ذو معنی ہیں اور ایک ہی وقت میں دو مختلف معنی کی حامل ہیں جن میں ایک کی سطح خارجی ہے دوسرے کی داخلی۔

اردو تنقید کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس نے میرا جی ایسے خالص ادب دوست اور ادب پرور سے ہمیشہ نظریں چرائی

ہیں۔فکری زوال کی حامل اردو تنقید نے میرا جی کے کام کو ہمیشہ شخصی پردے سے جھانکا اور شخصیت بھی وہ جو خود میرا جی نے لوگوں کو دکھائی۔ میرا جی پر لکھے جانے والے مضامین اور علمی تحقیق مقالات نے عام طور پر میرا جی کی شعری کائنات سے گریز کیا اور ان کی شخصیت کے گرد لپٹے لحافوں سے، میرا جی کی کل کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی اپنے تئیں کوشش کی۔جس کے نتیجے میں میرا جی سے وہ باتیں ، حکایات اور تعفّن سے بھر پور فضا منسوب ہوگئی، جو ایک طرف میرا جی کے شعری نظام سے لگا نہیں کھاتی اور دوسری طرف سطحی اور فروعی تنقید کے پھیلاؤ کا باعث ہے۔

میرا جی پر لکھے گئے مقالات میں، میری ناقص رائے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون ''دھرتی پوجا کی ایک مثال'' آج بھی اہم ہے اور کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ سہیل احمد کا مضمون ،مشمولہ میرا جی صدی،منتخب مضامین مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، عابد سیال، اپنی نوعیت منفرد اور اچھا مضمون ہے۔ سہیل احمد نے فرانسیسی شاعر چارلس بادلیئر اور میرا جی کے درمیان پائی جانے والی شخصی اور فکری مماثلتوں کا ذکر کیا ہے۔مضمون فکر، خیال، اسلوب کے حوالے سے رواں ہے اور میرا جی کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ۔ارشاد متین کا مضمون مشمولہ ''میرا جی صدی:منتخب مضامین'' نظری مباحث کے حوالے سے اچھا ہے لیکن وہ بھی میرا جی کے شعری نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نظموں کے تجزیے، استدلالی طریقِ تنقید سے میرا جی کی نظم کے مخفی پہلوؤں پر توجہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے مقالے میں میرا جی کے ذاتی حالات، سوانحی کوائف، شخصی مسائل، گھریلو حالات ، حلقہ اربابِ ذوق ، میراسین اور دیگر، نجی اور سماجی معاملات پر بہت محنت سے کام کیا ہے لیکن ان کی شعری کائنات کی طرف توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر فتح محمد ملک نے میرا جی کی بظاہر غلاظت سے اَٹّی شخصیت میں پوشیدہ صوفی کی روح کو تلاشنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے ہاں بھی بحث نظری ہے اور عملی تنقید کا عنصر بہت کم ہے۔سلیم احمد، ساقی فاروقی، جمیلہ شاہین کے مضامین بھی میرا جی کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔

ایسے تمام مضامین جن میں میرا جی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر وفن پر بھی بحث کی گئی ہے، آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اس پر بھی یہ مضامین میرا جی کی شاعری میں جنس، جنسی نفسیات کے مختلف رموز، ان سے جڑی لذت اور نفسی پیچیدگی، ہندی دیو مالا، مقامی رنگ کی آمیزش تک محدود ہیں ۔ ایک اور ذریعہ میرا جی کی تفہیم کے لیے ''مشرق ومغرب کے نغمے'' کو بنایا گیا جو کہ ایک اور طرح سے میرا جی کو سمجھنے کے لیے دور کی کوڑی لانا کے مترادف ہے۔ میرا جی کے تخلیقی کام کی بجائے اُن کے تراجم پر مباحث چھیڑنا اور ان کی بنیاد پر میرا جی کو سمجھنا، شخصیت کی حد تک بھی کوئی علمی عمل نہیں ہے۔

یہ مقالہ میرا جی کی شخصیت پر بحث سے گریز کرتے ہوئے، ان کی نظم کے براہ راست مطالعے سے میرا جی کے

نظامِ تفکر اور شعوری مدارج کی مختلف کڑیوں پر جستہ جستہ نظر دوڑاتے ہوئے ، ایک مرکزی نظام کی طرف بڑھے گا۔ اس سلسلے میں میرا جی کی تین منتخب نظموں ''تن آسانی ،سرسراہٹ اور یگانگت'' کا مطالعہ کیا جائے گا اور مختلف ناقدین کی آراء کی روشنی میں تجرباتی ، استدلالی طریقۂ تحقیق وتنقید کی مدد سے رائے قائم کی جائے گی۔ مفروضہ یہ ہے کہ میرا جی کی شعری بساط زندگی اور اس سے جڑے حقائق سے بھر پور ہے؟ اور میرا جی کے ہاں ابہام نہیں بلکہ ذومعنویت ہے۔ سوال کی نوعیت کو سمجھنے اور خیال کی تجرید کو تجسیم کرنے کے لیے بنیادی آلات برائے استخراج مواد کچھ یوں ہیں۔ کلیات میرا جی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۶ء۔ میرا جی ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۰ء۔ نظمِ جدید کی کروٹیں، ڈاکٹر وزیر آغا، سنگت پبلشرز لاہور، ۲۰۰۷ء۔ میرا جی صدی :منتخب مضامین، مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر عابد سیال ،مقتدرہ قومی زبان پاکستان ،۲۰۱۰ء۔

سوال کی تفہیم ،تعبیر اور توجیہہ کے لیے میرا جی کی نظم کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی جبکہ تجزیاتی مراحل کے دوران مختلف محققین اور ناقدین کی آراء پر بحث کی جائے گی۔ میرا جی کی نظم کو سمجھنے کے لیے ذہنی مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے اگر میرا جی کا قاری یا سامع علمی ، تجرباتی پس منظر کے ساتھ ، ان کی نظم کا مطالعہ کرے گا اور ان کے شخصی کوائف درمیان میں نہیں لائے گا تو میرا جی کی نظم ایک مسرت اور انبساط سے بھر پور تجربہ بن جاتی ہے۔ اگر آپ پہلے سے یہ طے کر لیں کہ میرا جی کے ہاں جنس اپنی مجروح ترین حالت میں ہے ۔ان کے تین گولے ان کی پتلون کی جیب میں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ میرا جی کی پتلون کی جیبیں اندر سے پھٹی ہوئی ہیں اور ان کا ہاتھ جیب میں الجھا ہے تو کہاں ممکن ہے کہ آپ نظم کا مطالعہ نظم کے متن میں رہ کر کریں گے؟ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ میرا جی کے نظامِ شعر کو جنس سے علاحدہ کر کے دیکھیں گے؟ لہٰذا اس مقالے میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ میرا جی کی نظم کے مطالعے کے دوران ان کی شخصیت کو بھول جائیں اور ان سے منسوب افسانوں کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دیں۔

نظم ایک اکائی اور کلی وحدت کا نام ہے۔ جس کے کلی تار و پود میں مختلف تمثال پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ تمثال مل کر ایک مکمل اور بامعنی تمثال بناتے ہیں ۔نظم نگار کا کام کسی تجربے ، شاعرانہ خیال، کسی نظامِ فکر کو نظم کے قالب میں ڈھال کر منظر عام پر لانا ہے جس کے توسط سے قاری لذت ، مسرت وعلم، فکر و خیال اور اثر انگیزی کشید کرتا ہے۔ شاعر یا نظم نگار اپنے تجربے ،فکر و خیال میں اپنے قاری یا سامع کو شریک بناتا ہے اور اس اثر سے روشناس کراتا ہے جس کی گرفت میں وہ خود رہا ہو۔ یوں گویا وہ اپنے تجربے ،فکر، خیال ، احساس ، جذبے کو اپنے قاری یا سامع کا تجربہ، فکر، خیال ، احساس ، جذبہ بنا دیتا ہے، میرا جی کی نظم گہری اور ذومعنی ہے اس کے اثر تک رسائی کے لیے اس انداز کی

گہرائی اور ذہنی مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرا جی کی نظم ''تن آسانی'' اردو نظم کی روایت میں اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد نظم ہے۔ نظم کا آغاز عورت کی نفسیات کا پیش کار ہے۔

''غسل خانے میں وہ کہتی ہیں ہمیں چینی کی اینٹیں ہی پسند آتی ہیں۔
چینی کی اینٹوں پہ وہ کہتی ہیں چھینٹا جو پڑے تو پل میں
ایک اک بوند بہت جلد پھسّل جاتی ہے''

''غسل خانہ'' جنسی استعارہ ہے۔ لیکن میرا جی کے ہاں یہ ایک خیال کی اُلجھن کا نمائندہ بن کر سامنے آیا ہے۔ جہاں وہ کہتی ہے کہ چینی کی اینٹ کی خوبی یہ ہے کہ پانی کی بوندیں اس پر نہیں ٹھہرتیں اور پل میں پھسل جاتی ہیں گویا فرش پھر سے صاف شفاف اور خشک ہو جاتا ہے۔ یہاں عورت کی نفسیات دکھائی گئی ہے جو مرد کی نفسیات سے مکمل طور پر الٹ ہے۔ مرد غسل خانے کو جنسی فعل کی جگہ کے طور پر دیکھتا ہے جب کہ عورت اسے گھر داری دیگر امور کی طرح ایک خاص طرح کی ذہنیت اور نفاست پسندی کے پس منظر کے ساتھ دیکھتی ہے۔ شاعر خود کلامی میں سوال کرتا ہے۔

''کوئی پوچھے کہ بھلا بوندوں کے یوں جلد پھسل جانے میں
کیا فائدہ ہے۔
جب ضرورت ہوئی جی چاہا تو چپکے سے گئے اور نہا کر لوٹے
دھل دھلا کر یوں چلے آئے کہ جس طرح کسی جھیل کے پانی پہ کوئی
مرغابی''

ان مصرعوں میں لفظ ''ضرورت'' ذو معنی ہے نہانے کی ضرورت گویا کسی خاص فعل کے بعد انسان نہا کر آئے تو دھلا دھلایا لگتا ہے، مرغابی کے مانند۔ مرغابی یہاں ایک استعارہ ہے اور مونث بھی، گویا محبوب کے دھلے دھلائے جسم کا اظہار ہے جس کو چینی کی سفید اینٹیں پسند ہیں۔ جھیل کے پانی پر مرغابی کا تمثال سفید چینی کی اینٹوں پر نہاتی اجلے بدن کی محبوبہ کا استعارہ ہے جو نظم کے معنی میں مزید وسعت پیدا کرتا ہے۔ نظم میں محبوب کو سفید اینٹیں پسند ہیں اور شاعر کو نکھرا نکھرا رنگ بھلا لگتا ہے۔ نظم کے اس بند میں جنس، محبوب، جسم، نہانے کے منظر سے آگے بڑھتی ہوئی زندگی کی حقیقت سے لبریز ہو جاتی ہے۔

''کوئی پوچھے کہ بھلا چینی کی اینٹوں کو کسی سوچ سے کیا نسبت ہے

چینی کی اینٹیں تو بے جان ہیں پھلواری ہیں ہر پھول کلی ہر پتہ

زیست کے نور سے لہراتا ہے

پھول مرجھائے کل کِھلتی ہے

اور ہر پتہ نئے پھول کے گُن گاتا ہے

چینی کی اینٹیں کوئی گیت نہیں گا سکتیں

چینی کی اینٹیں تو خاموش رہا کرتی ہیں

ایک گہرا تاسف نظم میں موجود ہے کہ چینی کی اینٹ کو بھلا سوچ سے کیا نسبت؟ یہ ایک بے جان شئے ہیں۔ یہ ایسی شے جو گیت نہیں گا سکتی، جب کہ پھلواری، پھول، کلی پتہ زندگی سے معمور ہیں۔ زیست کے نور سے لہراتے ہیں۔ پھول مرجھاتا ہے تو کلی کِھل اٹھتی ہے اور ہر پتہ نئے پھول کے گن گاتا ہے۔ زندگی کے مسلسل تخلیقی عمل کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں خاموش اینٹیں ٹھہراؤ اور جمود کی علامت بن جاتی ہیں۔ آگے چل کر نظم پھر ایک نیا موڑ لیتی ہے اس نئے ٹھہراؤ سے نظم کے معنی مزید وسیع ہوتے ہیں اور حقیقت سے بھرپور بھی۔

''اور کوئی بات کریں

اور یوں ہی لیٹے رہتے ہیں کسی کے دل میں

دھیان آتا ہی نہیں

غسل خانے میں قدم رکھیں نہا کر سوئیں

لیٹے لیٹے یونہی نیند آتی ہے سو جاتے ہیں''

نظم کا انجام دو ایسے کرداروں کے تمثال پیش کرتا ہے جو لیٹے ہوئے ہیں اور آپس میں گفتگو کرتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ میراجی نے کمال خوبی سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فکر، جنس پر حاوی ہوتی ہے اور انسان کسی خیال کی لپیٹ میں سوچتا سوچتا سو جاتا ہے نہ وہ کسی قسم کے جسمانی رومان کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ غسل خانے میں جا کر نہاتا ہے۔ جنسی استعارات سے آغاز پانے والی نظم اپنے انجام پر ایک تاسف، ایک گہرا ملال چھوڑ جاتی ہے۔ جو زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ جو زندگی کی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔ نظم میں بے ربط کلام ہے جو زندگی کی بے ترتیبی کا نمائندہ ہے۔ خواہش کا اختلاف ہے۔ عورت اور مرد کے تصورِ حسن کا اختلاف ہے۔ ان کے سوچنے کے نظام کا اختلاف ہے۔

میرا جی نے عورت کی نفسیات اور مرد کی نفسیات کے باہمی ارتباط اور اختلاف سے زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ جو اپنے انجام پر نیند کی علامت اوڑھ لیتی ہے، یہاں نیند پھر ذو معنی استعارہ ہے۔ ایک رات کی نیند یا ہمیشہ کی نیند۔ اور نہائی مرغابی، دھلا دھلایا جسم، نکھرا نکھرا رنگ پاس پڑا رہتا ہے۔

میرا جی کی ایک اور نظم ''سرسراہٹ'' ہے جو ۱۹۴۱ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ نظم جنسی تجربے کی نمائندہ ہے ایک خالص جنس سے بھرے تجربے کی نمائندہ اس نظم میں خارجی دنیا سے کچھ دیر کی آزادی کے لیے جنسی تجربے کو ڈھال بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ موضوع کے ساتھ برتاؤ بہت مختلف اور بامعنی ہے اور تہہ در تہہ گہرائی کا باعث ہے۔

''یہاں۔۔۔ ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں؟
یہ لہریں بس بہی جاتی ہیں اور مجھ کو بھاتی ہیں
یہ موجِ بادہ ہیں ساغر کی، خوبیدہ فضا دل میں
اچانک جاگ اٹھتی ہے''

''سِلوٹ'' اس نظم کا بنیادی استعارہ ہے۔ جس کے کئی معنی ہیں۔ جسم کی سلوٹ؟ خیال کی سلوٹ؟ محبوب کی ادا کی سلوٹ؟ جس پر ہاتھ رکھنے کی خواہش شاعر کے ہاں موجود ہے۔ ''ہاتھ رکھنا'' فعل ہے جو دو اجسام کے ملاپ کا نمائندہ بن رہا ہے۔ گویا اس ملاپ کے ساتھ ہی شاعر خوابیدہ فضا میں داخل ہو جائے گا اور یہ سلوٹ اس کو اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہی ہے۔ یہاں شاعر رومانوی تجربے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کی مُنہ زوری کا تمثال بناتا ہے جو حسّی اور احساسی ہے۔ ایک مجرد تمثال جو جسم نہیں بنتا مگر اپنا پورا وجود اور اہمیت رکھتا ہے۔

''حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں''

دو اجسام کے ملاپ اور اس سے جڑی حقیقت کا بیان ہے کہ اگر کوئی حقیقت کے جہان سے اس دنیا میں داخل ہو جائے تو اس کے ہونٹ تبسم سے بھر جائیں۔

گویا حقیقت کا جہان تبسم سے خالی اور دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ میرا جی کی نظم میں استفہام، نظموں کی معنویت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

بہانہ کیا تھا؟ سلوٹ کیا تھی، موجِ بادہ بھی کیا تھی۔

یہ مصرع اور اس طرح کے دیگر مصرعے میرا جی کی نظموں کلی فضا میں وسعت کا باعث بنتے ہیں اور یہی نئی نظم کا انفرادی اعجاز بھی ہے نظم میں جنسی تجربے کا بیان ہے۔ابہام معنوی وسعت اور قاری کے دل ودماغ میں خفیف سرسراہٹ کا باعث بنتا ہے۔سلوٹ نظم کا بنیادی استعاراتی تمثال ہے جو دیگر تمثالوں سے جڑا ہوا ہے اور پوری نظم کے مابین ربط کا باعث ہے۔اصل تجربہ سلوٹ پر ہاتھ رکھنا ہے۔جو شاعر میں ایک طرح کی جھجک اور گریز کی کیفیت کو پیدا کررہا ہے۔شاعر کے مطابق یہ ''سلوٹیں'' لہروں کی مانند ہیں جو اس کو بہائے لے جارہی ہیں۔ یہ ایک خواب سے بھر پور فضا ہے کہ اگر کوئی حقیقت کے تلخ جہان سے ادھر کو آجائے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم اور مسرت آجا اور وہ گویا ایک پل کو حقیقت اور خارج کی دنیا کے تمام کرب سے نجات پالے۔

میرا جی کی ایک خصوصیت اپنی نظموں میں معنوی موجود پردۂ سکرین کو اچانک کھینچ کر، ایک نیا پردہ لانا ہے۔ جو پہلے سے موجود رنگ سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔لیکن نظم کے کل میں اس کا ایک لازمی حصہ بھی۔ جو فکر کے ارتقائی عمل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔جیسے اس نظم میں پوری فضا بنانے کے بعد شاعر کہتا ہے۔

''ہوا ہے گم۔۔۔۔ یہ سب موجِ تخیل کی روانی تھی''

اب نقاد چاہے تو رک کر اس نئے منظر سے نظم کے متن میں برپا ہونے والی تبدیلی اور معنویت کو دریافت کرلے اور چاہے تو جلد بازی میں وہ اس ''موجِ تخیل کی روانی'' کو میرا جی کی شخصی پیچیدگی کے ساتھ جوڑ کر نظم اور اس کے معنی کو ادھورا چھوڑتا ہوا، ابہام زدہ قرار دے بلکہ جنس کی ایک نسبتاً غلیظ کیفیت کے ساتھ جوڑ کر، نظم کے سارے شاعرانہ انبساط کو ضائع کردے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ

''میرا جی کی شاعری کا تخلیقی وفکری مزاج ہی ایسے خمیر سے اُٹھتا ہے کہ ابہام کے بغیر (گو اس کی سرحدیں اغلاق سے بھی مل جاتی ہیں) اس کا موزوں اظہار ممکن نہیں ہے۔ پھر ساتھ ساتھ علامات کے طور پر بہت سے الفاظ مثلاً سمندر، سایہ رات، اندھیرا، اجالا، چاند، نیلگوں وغیرہ اس طور استعمال میں آتے ہیں کہ وہ مخصوص معنی اور ذہنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں اور یہ عوامل مل ملا کر میرا جی کی شاعری میں کیفیات کا دھندلکا، ذہنی فضا کا اندھیرا اجالا دھیما دھیما پن، پرخلوص جذبہ کی پاکیزگی اور غم اور کرب کی میٹھی میٹھی کسک اور لذت پیدا کردیتے ہیں''[1]

جالبی صاحب میرا جی کے تخلیقی وفکری مزاج (گویا اس پورے نظام) کو ابہام کے خمیر سے اُٹھاتے ہیں۔ وہ میرا

جی کی علامات کو بھی جنسی قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں ان علامات کی استعاراتی اور تشبیہاتی سطح کو فراموش کر دیتے ہیں۔اور اس سلسلے میں ان علامات کی استعاراتی اور تشبیہاتی سطح کو فراموش کر دیتے ہیں۔اور ان کے مطابق میرا جی کی شعری فضا دھند لکے اور اندھیرے اجالے پر مبنی ہے۔ جالبی صاحب میرا جی سے جوڑ دیتے ہیں۔وہ یہ نہیں کرتے کہ اس کمرے میں موجود میرا جی کے فکر و خیال پر نظر کریں بلکہ وہ میرا جی سے لاتعلق ہو کر کمرے کی فضا میں الجھ جاتے ہیں اور اس حوالے سے معین آر کی ٹائپ کو میرا جی سے جوڑ دیتے ہیں۔

میرا جی کی نظمیں اپنے قاری سے ایک ذہنی مجاہدے، فکری بالیدگی اور اعتدالی رویے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان نظموں میں گہرائی ہے۔ یہ موضوعی سطح پر واضح اور صاف ہیں تاثراتی سطح پر ابہام کی ہلکی سی لہر ہے جس سے قاری ڈگمگا جاتا ہے اور اچانک سے اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔میرا جی کی موجودہ نظم کو ان مصرعوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

''مگر شب کی اندھیری خلوتِ گمنام کے پردے میں کھو کر ان کو یہ معلوم ہو جائے گا اک پل میں
اور اک لذت کے کیفِ مختصر میں کھو کے وہ بے ساختہ یہ بات کہہ اُٹھیں گے کیا مجھ کو اجازت ہے
یہاں ان سلوٹوں پہ ہاتھ رکھ دوں؟۔۔۔۔۔ یہ جھجک کیسی؟

ارشاد متین میرا جی کے فنی نظام کے متعلق رائے دیتے ہیں۔

''اردو شاعری میں میرا جی متنوع تجربات کے حامل ہیں۔ان میں زیادہ اہم جنسی نفسیات، علامات اور ہیت کے تجربات ہیں۔ ان تجربوں سے اردو ادب کو ایک نیا پیرایۂ اظہار ملا اور شاعری کی ایک نئی روایت نے جنم لیا۔جنسی نفسیات کا تجربہ میرا جی کی شاعری کا منشور ہے جس میں جھانک کر ہم اس کے سارے رنگوں اور پہلوؤں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔''[۲]

ارشاد متین کی بحث نظری ہے اور عملی تنقید سے خالی ہے اور وہ آخر کار میرا جی کی جنس اور جنسی نفسیات پر آ کر رک جاتے ہیں اگر وہ نظموں کے مطالعے بھی پیش کرتے جاتے تو خوب اچھا ہوتا۔

میرا جی کے ہاں اپنے عہد کے فرد کی تنہائی اور داخلی کرب کا نوحہ ہے جس کی تسکین کے لیے وہ مختلف راستے تلاش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مروجہ اقدار اور نظامِ حیات کی نفی کرتا ہے۔ یوں وہ محض جنس پرست نہیں ٹھہرتا بلکہ اس کا سفر خارج سے داخل کی طرف ہوتا ہے۔ میرا جی خود میں موجود امکانات کی دریافت کی طرف مائل ہے۔نفسی الجھنوں کے بیان کے لیے وہ سیدھی اور صاف زبان کی بجائے نئے علامتی نظام کو بروئے کار لاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد چارلس بودلیئر اور میراجی کے تقابلی مطالعے کے دوران لکھتے ہیں۔

''بودلیئر کی طرح میراجی نے بھی جدید عہد کے شعور سے اپنا مواد حاصل کیا بودلیئر کی طرح اسے بھی جنس پرست شاعر قرار دیا گیا مگر اس کا مقصد بھی جنس نگاری تک محدود رہنا نہیں تھا۔ بلکہ عہدِ جدید کے انتشار کو سمجھنا تھا وہ جدید زمانے کے باطن میں اتر کر جدید انسان کی روح کا سراغ لگانا چاہتا تھا جسے صنفی دور کا انسان افراتفری میں گم کر بیٹھا ہے۔''[۳]

عمر بھر کی محرومی کے احساس پختہ، خلا کی کیفیت اور ذہن میں پیوست الجھنوں نے میراجی کے پورے نظامِ فکر و خیال پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مگر ان کی نظم معنویت اور گہریت سے بھری ہوئی۔ زندگی اور وقت کی طاقت کا اظہار اس نظم کے داخل اور خارج میں دیکھا جاسکتا ہے۔

''زمانے میں کوئی برائی نہیں ہے
فقط اک تسلسل کا جھولا رواں ہے
یہ میں کہہ رہا ہوں''

کتنا خوب اور رواں ابتدائیہ ہے کہ زمانہ بُرا نہیں بلکہ برائی کہیں اور ہے۔ زمانہ تو محض تسلسل ہے۔ ارتقا ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہاں زمانہ وقت کا نمائندہ بنتا ہے۔ جس طرح مجید امجد اسے سماج کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ اس عمل کو بھی الگ سے مکمل طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ میراجی کیوں اپنی ذات کو وقت کے تسلسل سے الگ کہتے ہیں مگر اپنے انجام تک نظم بہت بڑے کینوس تک پھیل جاتی ہے۔ جب شاعر یہ کہتا ہے کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آ کر ملے ہیں۔ گویا شاعر کے نزدیک فرد ہی پیدائش ہے اور فرد ہی موت، فرد ہی آغاز ہے اور فرد ہی انجام۔ میراجی نے یہاں خود کو پورے بنی آدم کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ اس موڑ پر فنا اور بقا ایسے فلسفیانہ مباحث بن جاتے ہیں جن کی حیثیت محض اضافی سی رہ جاتی ہے۔ اور انسان اس زندگی اور موت کی کشمکش سے بلند ہو کر ایک طاقت بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسی طاقت جو وقت کے روبرو کھڑی ہو جاتی ہے۔

مجید امجد کے ہاں فرد انفرادی حیثیت سے آگے سفر نہیں کرتا جب کہ میراجی نے فرد کو پورے انسانیت کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مجید امجد انسان کو وقت کی طاقت کے سامنے مجہول اور کمزور قرار دیتے ہیں جب کہ میراجی کا انسان وقت کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ گرتا ہے پھر کھڑا ہو جاتا ہے، مرتا ہے پھر پیدا ہو جاتا ہے، سڑک پر دوڑتی گاڑیاں اسے روندتی ہیں تو وہ زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوتا اور پھر سے چھچلتی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے گویا

ایک بار پھر موت کا مقابلہ کر رہا ہو۔ مجید امجد کا انسان اپنے انجام پر بے نشان ہوتا ہے مگر میرا جی کا انسان اپنے انجام پر ایک نئے ابتدا کی خبر دیتا ہے۔ یوں مجید امجد کے ہاں موت ایک دائمی دکھ کی علامت ہے جو انسان کو نابود کر دیتا ہے۔ جبکہ میرا جی کے ہاں موت تسلسل کے جھولے کا ایک دائروی چکر ہے جو ایک نئے حُر کی عمل کا پیش خیمہ ہے اور ایک نئی زندگی کا پیش کار۔ مجید امجد کے ہاں موت ٹھہراؤ ہے اور میرا جی کے ہاں موت مسلسل عمل میں ارتقا کی ایک صورت جس کے بناحیاتِ کائنات جمود کا شکار ہو جائے۔

''برائی، بھلائی، زمانہ، تسلسل۔ یہ باتیں بقا کے گھرانے سے آئی ہوئی ہیں
مجھے تو کسی بھی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے
میں ہوں ایک اور میں اکیلا ہوں، ایک اجنبی ہوں''

نظم میں ذات کی نفی کا عمل ہے ایک ایسی نفی جو اثبات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے بقا کا تعلق فنا سے الگ کر دیا جاتا ہے اور فنا کا سلسلہ بقا سے توڑ دیا جاتا ہے۔ اس فنا اور بقا کے سلسلے کو کس خوبی سے میرا جی نے بیان کیا ہے۔

''یہ اجڑے ہوئے مقبرے اور مرگِ مسلسل کی صورت مجاور
یہ ہنستے ہوئے ننھے بچے، یہ گاڑی سے ٹکرا کے مرتا ہوا اندھا مسافر
ہوائیں، نباتات اور آسماں پر ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوئے چند بادل
یہ کیا ہیں
یہی تو زمانہ ہے، یہ ایک تسلسل کا جھولا رواں ہے''

یہ نظم فنا اور بقا کے اساسی تصور کو باہمی ملاتی ہے اور وقت کا ایک بہت مضبوط اور کڑا تصور سامنے آتا ہے۔ اپنے فکری نظام اور انسان کے روزمرہ معاشرتی پس منظر میں نظم مجید امجد کی ''کنوں'' سے وسیع تر مفاہیم کی حامل ہے۔ اس میں زندگی، موت ایک تسلسل کے جھولے کی صورت میں جو سدا رواں رہتا ہے۔

زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے تسلسل کا جھولا رواں ہے۔ کیا خوب مصرع ہے گویا پوری انسانیت کا راز ہے اس کائنات میں کسی بھی شئے کو اہمیت اور استحکام حاصل نہیں ہے لیکن یہی عدم اس زمانے کی بقا کا ضامن ہے کائنات میں برپا تبدیلی، فنا، موت، جہالت ہی اس کے استحکام کی وجہ ہے۔

ڈاکٹر فتح محمد ملک کے مطابق

''میراجی نے اپنی شاعری کی وساطت سے جس خیالی دنیا کو پیدا کیا اس میں زندگی کے عام مظاہر ایک انوکھی دل کشی کے حامل نظر آتے ہیں یہ دنیا کچھ رنگ کے نور کچھ آوازوں اور کچھ سایوں کی دنیا ہے''[۴]

فتح محمد ملک کا تجزیہ بھی دیگر ناقدین کی مانند سطحی اور یک رخ ہے اور اُنھیں جملوں کی تکرار ہے جو میراجی سے منسوب ہے۔ فتح محمد ملک میراجی کی نظموں کے تجزیے سے اپنے بیان کو مضبوط بنا سکتے تھے لیکن تجزیاتی تنقید کا عالم اردو ادب میں خاصا کمزور ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا بیان بہت خوب ہے اور آج بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون میراجی کی وطن پرستی اور ہند، بنگال محبت سے بحث کرتا ہے۔ اس ایک نکتۂ نظر کے حوالے سے وزیر آغا کا مضمون اہم ہے جس طرح جدید فکر کی آویزش کے حوالے سے سہیل احمد کا مضمون میراجی پر اساسی نوعیت کا حامل ہے۔

''میراجی کی نظمیں دھرتی پوجا کی ایک انوکھی مثال پیش کرتی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ اردو نظم میں میراجی وہ پہلا شاعر ہے جس نے محض رسمی طور پر ملکی رسوم اور مظاہر سے وابستگی کا اظہار کیا اور نہ مغربی تہذیب سے ردِعمل کے طور پر اپنے وطن کے گن گائے ہیں بلکہ جس کی روح دھرتی کی روح سے ہم آہنگ اور جس کا سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملکی روایات، تاریخ اور اساطیر سے مملو ہے۔''[۵]

ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون میراجی کی نظموں میں دیس پریت پر اچھی بحث ہے اس حوالے سے میراجی پر مزید کام کیا جا سکتا ہے۔

شاعر کا اصل کام اپنے تجربے، خیال اور فکر کو ادب اور شاعری بنانا ہے۔ اگر وہ پہلے مرحلے میں خوبی سے گزر جاتا ہے تو دوسرا مرحلہ اس ادب پارے کی قدر و قیمت سے متعلق ہے کہ اس تجربے میں معیاری قدر کا ہونا لازمی ہے۔ اگر شاعر اپنے تجربے کو مناسب الفاظ میں ڈھال کر سامنے لاتا ہے اور اس کے اصل تصور کو قائم رکھتے ہوئے، اس کے اثر میں شدت پیدا کرتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کامیاب ہے۔ امر ضروری ہے کہ شاعر اپنے تجربے کو گہرائی، نزاکت، تازگی اور ندرت کے ساتھ بیان کرے۔ شاعری اصل کا عکس ہوتی ہے جس میں شاعر اپنی شاعرانہ قدرت، زبان پر دسترس اور داخلی کرب کے وسیلہ سے جذبے اور اثر کی شدت کو پیدا کرتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کا زینہ بنتے ہیں۔ میراجی کی نظموں میں تجربہ مکمل حسن اور حقیقت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ میراجی کی نظمیں اپنے قاری کو ایک مسرت سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ نظمیں زندگی کے گہرے شعور کی حامل ہیں۔ یہ نظمیں وقت کی بے پایہ طاقت کا اظہار یہ ہیں میراجی کی انفرادیت اس کا فکری اور اظہاری تنوع ہے۔ اس کی نظمیں ہیت اور موضوع کے بیان کے لحاظ سے اپنے عہد میں

سب سے آگے کھڑی ہیں۔ میرا جی کا شاعرانہ اظہار تکنیک کے حوالے سے منفرد بھی ہے اور جدید بھی۔ میرا جی کے ہاں نظم کئی چھوٹے چھوٹے تمثال کی صورت میں تعمیر ہوتی ہے یہ تمثال ایسی اکائیاں ہیں جو انفرادی سطح پر ایک نامکمل چہرہ ہیں۔ ان کا غلط اجماع معنی کو بگاڑ دیتا ہے اور ابہام اور لایعنیت کی طرف لے جاتا ہے جبکہ اگر انھیں سلیقے اور ترتیب سے جوڑا جائے تو ابلاغ معنی میں حائل رکاوٹیں خود بہ خود دور ہونے لگ جائیں۔ اردو کا نظامِ تنقید اگر تھوڑے غور و فکر سے کام لے اور میرا جی کے شعری سرمائے پر جمی گرد ہٹائی جائے تو میرا جی کے شعری جہان میں موجود امکانات کو روشن کیا جا سکتا ہے۔ جو اُردو نظم کی روایت کو مزید استحکام اور وقار سے لبریز کرے گا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، میرا جی ایک مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۹۲

۲۔ ارشاد متین، ''جدید نظم اور میرا جی''، مشمولہ: میرا جی صدی: منتخب مضامین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۰

۳۔ سہیل احمد، چارلس بودیلیئر اور ''میرا جی: مماثلتیں اور اختلافات''، مشمولہ: میرا جی صدی: منتخب مضامین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸۸

۴۔ فتح محمد، ملک، ''میرا جی کی کتابِ پریشاں''، مشمولہ: میرا جی ایک مطالعہ، مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۲۶۰

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۵